ڈاکٹر بلقیس اختر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، شاہکوٹ

ڈاکٹر نازیہ پروین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور، فیصل آباد کیمپس

ڈاکٹر جاوید اقبال جاوید، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، ڈپٹی ڈائریکٹر یونیورسٹی پبلی کیشنز، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Dr. Bilqees Akhtar, Assistant Professor, Department of Urd, Govt. Associate Colleg for Women, Shahkot.

Dr. Nazia Parveen, Assistant Professor Department of Urdu, University of Education, Lahore, Faisalabad Campus.

Dr. Javed Iqbal Javed, Assistant Professor, Department of Urdu, Deputy Director University Publications, Leads University, Lahore

شمالی علاقہ جات کی تہذیب و ثقافت کے پاکستانی ناول پر اثرات

THE INFLUENCE OF THE CULTURE AND CULTURE OF THE NORTHERN REGIONS ON THE PAKISTANI NOVEL

Abstract:

It is made up of rugged plains, smooth valleys and bare mountain ranges. The Baloch nation has been a follower of the ancestral system and the custodian of civilizations since traditional times. Balochistan is exclusive from other provinces of Pakistan in terms of language, culture and customs. Agha Gul is a writer from Balochistan who is rich in high creative talents. He encouraged Baloch philosophy through novel writing. His novel “Dasht-e-wafa” is the reflection of the Baloch Culture and Civilization of 1970’s. In addition to Balochi language politics and history, the novel also discusses the reasons for the slow pace of cultural evolution in Balochistan. Agha Gul in novel “Bella” shows the different colors of Balochi Culture and civilization to the readers. This novel introduces the cities, towns, geography and folk lagend beliefs of Balochistan through the story of driver Rehman.

Key Words: *Baloch nation, mountain ranges, Agha Gul, Dasht-e-wafa, Culture and civilization, geography.*

تہذیب تمدن کی پیش رو ہوتی ہے تہذیب کو کسی شہر، دیہات، کوہستان اور صحرا تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیب بنیادی طور پر کسی بھی معاشرے کی انفرادی و اجتماعی تخلیقات اور اقدار کی عکاس ہوتی ہے۔ اس لیے تہذیب کے آثار و نشانات ہر معاشرے میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیب و ثقافت معاشرے کا طرزِ فکر و احساس اور طرز زندگی کا جوہر ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانی رہن سہن، زبان و ادب، آلات و اوزار، سماجی رشتے، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، عقائد و افسوں، قرابت داری، وضع داری، شادی بیاہ، میلے تیوہار، اخلاق و عادات اور رسم و رواج

وغیر ہم تہذیب کے مختلف عناصر ہیں۔اس حوالے سے بلوچستان کا تہذیبی و ثقافتی تمدن قابل ذکر ہے جس کے آثار اُردو ادب اور خصوصاً اُردو ناول میں ملتے ہیں۔اشتیاق احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"کلچر معاشرے کے مجموعی طرز عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔اور طرز عمل معاشرے کے ان بنیادی اداروں سے متعین ہوتا ہے جنھیں ہم مذہب، معیشت، فنون و ہنر، سیاست زبان، علم، سائنس وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بنیادی تہذیبی ادارے معاشرے کی فکر اور اس فکر سے پیدا شدہ اقدار و معیار کا نتیجہ ہیں اور جو بحیثیت مجموعی معاشرے کے طرز عمل کو متعین کرتے ہیں۔ ان میں بہت سے تصورات، معیار اور اقدار ایسے ہیں جو ہمیں اسلاف سے ورثے میں ملے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو کسی دوسری قوم کے اختلاط سے حاصل ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو گردوپیش کے طبعی حالات اور آب و ہوا کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں معاشرے کے تاریخی بہاؤ میں ترقی یا تنزل کی حالت میں پیدا ہو گئے ہیں۔یہی وہ عوامل ہیں جن کے سمجھنے سے کسی قوم کے کلچر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"(۱)

شمالی علاقہ جات، جغرافیائی، دفاعی، ثقافتی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے پاکستان کا ایک اہم حصہ ہے۔ بنیادی طور ان علاقوں کی کوئی انفرادی پہچان نہیں ہے۔ آغاز میں یہ علاقہ جات کشمیر کا حصہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ علاقے بھی پاکستان کا حصہ بنے، تاہم ان کی آئینی اور سیاسی حیثیت الگ تھلگ رہی۔اس کے رد عمل میں ان علاقوں میں خاطر خواہ ترقی کے امکانات پیدا نہ ہو سکے۔ سیاحت اور لسانیات کے حوالے سے یہ دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں اور اب بھی ان کی شہرت انھی حوالوں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ شمالی علاقہ جات کی مقامی زبانیں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر توجہ کا باعث رہیں۔ اُردو ادب کے مطالعے کا موضوع تشنہ رہا۔ یہاں اُردو زبان کا نفاذ لگ بھگ ۷۰ اسال قبل ہو گیا تھا اور اس کے بعد اُردو ادب کے ارتقا میں مقامی ادبا و شعرا کا کردار اہم رہ چکا ہے۔ پاکستان کے تمام صوبوں سندھ ، سرحد، پنجاب اور بلوچستان کے علاوہ آزاد کشمیر میں بھی اُردو کے ارتقا میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اُردو ادب کی تمام اصناف خصوصا ناول میں ان علاقوں کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے۔

شمالی علاقہ جات ۱۹۹۹ء میں پہلا ناول " بہتے لہو کے دھارے" (۱۳۵) کے عنوان سے شایع ہوا۔اسی ناول کے مصنف عبد السلام ناز نے بعد ازاں دو اور ناول بھی لکھے، جن میں پردیس (۱۳۶) شامل ہیں۔ تمام ناولوں کا موضوع جہاد کشمیر ہے۔ مصنف نے نسیم حجازی کی تحریروں سے متاثر ہو کر اپنے ناول کا انتساب ان کے نام کیا ہے۔ناول کی مقصدیت کے پیش نظر عبد السلام ناز نے تمام ناولوں کے موضوعات میں جہاد کی اہمیت کو مد نظر رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ناول کے تقاضوں کے مطابق غیر محسوس انداز میں رومانویت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ شمالی علاقہ جات کے معاشرتی تقاضوں اور موضوع کی سنجیدگی کے باعث یہ عصر کم ہے ۔ اب تک مقصدیت ہی ان کے ناولوں پر حاوی رہی ہے۔

شمالی علاقہ جات کی تہذیب و ثقافت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ان علاقہ جات میں اگر بلوچستان کے حوالے سے بات کی جائے تو بلوچستان، رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس علاقے کا بیشتر حصہ غیر مستقل دریاؤں، چٹیل میدانوں ،ناہموار وادیوں اور برہنہ پہاڑوں کے سلسلے سے مرتب ہے۔ مغربی بلوچستان جس کا رقبہ ۵۵۸ ہزار مربع کلومیٹر ہے چار سیاسی جغرافیائی حصوں میں منقسم ہے۔ سرحد، سراوان ،بمپور اور مکران وغیرہ،

سرحد کے علاقے میں، جو مغربی بلوچستان کے شمال میں واقع ہے بے شمار سلسلہ ہائے کوہ پھیلے ہوئے ہیں یہاں ریت اور پتھریلی وادیاں ہیں۔

"اس علاقے کے مرکزی حصہ کے پہاڑوں کے سلسلے میں سب سے اونچا پہاڑ "تفتان" ہے جس کی چوٹیاں سطح سمندر سے ۴۱۵۰ میٹر تک اونچی ہیں"[۲]

شمالی علاقہ جات کے علاقوں کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ مشرقی بلوچستان کا کل رقبہ ۴۰۵، ۳۰ مربع کلومیٹر ہے ژوب، کوئٹہ، نشین، سبی، لورالائی کچ گنداواہ، چاغی، خاران، سراوان قلات، جھلاوان، مکرن اور لسبیلہ مشہور شہر ہیں۔ مشرقی بلوچستان جغرافیائی حالات کی وجہ سے اپنے ہمسایہ دوسرے پاکستانی صوبوں سے نمایاں تفاوت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے ایران کے جنوب مشرقی حصہ کے سطح مرتفع سے زیادہ مطابق رکھتا ہے۔

"بلوچستان میں بارش بہت کم ہوتی ہے سال میں اوسطاً سولہ بارانی دن ہوتے ہیں جو سندھ کے ماسوا برصغیر کے دیگر مقامات کے مقابلے میں بہت کم ہے بارشیں دسمبر اور فروری میں ہوتی ہیں اور اوسطاً ۱۲۷۶ ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے "[۳]

گرمی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ برداشت سے باہر ہو جاتی ہے نباتات کے لحاظ سے بلوچستان بہت مفلس علاقہ ہے خصوصاً مکران کا ساحلی علاقہ، اس علاقے میں میووں کی بہت کمی ہے، لوگ بارش کا پانی پیتے ہیں اور مچھلی کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ سبی اور ڈھاڈر بہت زیادہ گرم خطے ہیں۔ بلوچستان کے شمالی پہاڑی علاقوں میں کہیں کہیں پستے کے جنگل اور صنوبر کے درخت بھی نظر آتے ہیں۔ بلوچستان کے جنوبی حصوں میں کھجور اور زیتون کے جنگل اور آم کے درخت پائے جاتے ہیں اور کوئٹہ کے علاقہ میں میوہ جات کے باغات ہیں۔

سخت سردی، تند و تیز ہوائیں طوفانی سیلاب، چلچلاتی گرمی،، گرد و غبار کے جھکڑ، پتھریلی سخت اور ریتلی زمین، بلوچستان کی جغرافیائی خصوصیات ہیں۔ اس صوبے کے سخت حالات میں موسم بہار بہت مختصر ہوتا ہے اور سرسبز مقامات، صرف چند جزیروں تک محدود ہیں۔ یہاں بسنے والی بلوچ قوم قدیم زمانے سے ہی شہرت رکھتی ہے۔ ان کے بارے میں مختلف نظریات پیش ہوئے بعض لوگ انہیں "عرب النسل کہتے ہیں بعض ترکی اور بعض انہیں راجپوتوں کی اولاد کہتے ہیں۔

"بلوچوں سے متعلق جو شواہد بھی فراہم ہو سکے ہیں ان سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق آریائی نسل سے ہے ان کی زبان ثقافت، رسم ورواج، عادات واطوار رہنے سہنے اور جنگ وجدال کی روایات تہوار وغیرہ سب آریاوں سے ملتے جلتے ہیں"[۴]

"کرد" اور میری" بھی بلوچوں سے مماثلت رکھتے ہیں "کرد" آریائی لوگوں پر مشتمل تھے یہ شمال سے ایران میں وارد ہوئے اور ساتویں صدی قبل مسیح میں اپنی ترقی کی بلندی تک پہنچ گئے۔ بلوچوں اور کردوں کی زبان ثقافت رسم ورواج، عادات واطوار بھی مماثل ہیں۔ بلوچ قبائل کی بہت سی شاخیں "کرد" قوم کا جزو ترکیبی ہیں۔

بلوچ	کرد
بگٹی	بعتی
مری	ڈولا مری
ماماشاہی	مماش

گیر د کر د[۴]

یہ بات مشاہد میں آتی ہے کہ بلوچوں کا ذکر تاریخ میں بہت زیادہ نہیں ملتا سب سے پہلے "شاہ نامہ فردوسی" میں ساسانی دور حکومت ۲۲ -۶۵۱ عیسوی میں ملتا ہے۔ فردوسی کی توثیق کے مطابق بلوچ نوشیر واں عادل کے عہد تک ایک منظم جماعت بن چکے تھے۔ بلوچوں کے تمدن کا نمایاں وصف ان کی خانہ بدوشی ہے۔ یہ لوگ شہروں میں نہیں بستے تھے بلکہ قبائل کی حیثیت میں مختلف چراگاہوں میں نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔

بنیادی طور پر بلوچ قوم برصغیر پر حملہ کرنے والوں کے خلاف بھی صف آراء رہی۔ بلوچ قوم اتنی طاقت ور تھی کہ نوشیر واں کو بہ نفس نفیس ایک لشکر جرار لے کر بلوچوں کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑی تھی۔ محمود غزنوی کے دور میں بھی بلوچوں نے سخت مزاحمت کی یہاں تک اسے اپنے بیٹے کی قیادت میں بھاری فوج بھیجنا پڑی۔ بلوچوں کے چوالیس قبائل دو بڑی شاخوں رند اور لاشاری میں منقسم ہیں جو بہت سی اندرونی اور بیرونی جنگوں میں بھرپور مزاہمت کرتے رہے۔

پروفیسر عزیز محمد بگٹی بلوچستان میں مروج قبائلی نظام کو متعارف کرواتے ہیں:

> "بلوچوں کا قبائلی نظام اپنی ساخت کے اعتبار سے تکون کے تین اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس میں قبائلی رسم ورواج سردار اور مقدم وڈیرے یا ٹکڑی شامل ہیں۔ بعض لوگ اسے غلطی سے سرداری نظام کا نام دیتے ہیں حالانکہ سردار قبائلی نظام کا ایک جزو ہے کل نہیں ہے۔ اس نظام میں اولیت قبائلی رسم ورواج کو ہے۔ جس کی پابندی سردار کو بھی اسی طرح کرنی پڑتی ہے جس طرح ایک قبائلی کو۔ قبائلی اسمبلی سردار، وڈیروں یا ٹکڑیوں پر مشتمل ہے۔ یہی اسمبلی یا جرگہ قبائلی رسم ورواج میں ترمیم و تبدیلی کا مجاز ہے۔ وڈیروں کے بغیر سردار کی خاص حیثیت نہیں ہے۔ اسی طرح سردار کے بغیر وڈیرے کوئی اہمیت نہیں رکھنے۔"[۵]

جب بلوچستان میں انگریزوں کی آمد ہوئی تو ان کے قبائلی نظام میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئے ہوئیں۔ انگریزوں نے قبائلی سرداروں کو بہت مراعات دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ مزید انہیں اس بات پر بھی آمادہ کیا کہ وہ بلوچ قوم کو انگریزوں کے خلاف کسی بھی قسم کی کاروائی کرنے سے روکیں گے۔ اس طرح اس نظام میں بہت سی منفی روایات بھی شامل ہوگئیں اور ان کی آپس میں کشیدگی بھی بڑھ گئی۔ بلوچ قوم نے اگرچہ تاریخ میں کوئی بڑا نام پیدا نہیں کیا لیکن ان لوگوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ یہ لوگ موسموں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئ چراگاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے آئے ہیں۔ بلوچ قوم اپنے تمام نظریات میں شاید متحد نہ ہو لیکن بحیثیت بلوچ ایک قومیت کے افراد کے سب متفق ہیں اور اس شعور میں روزبروز اضافہ ہورہاہے۔

بلوچوں کی اکثریت اپنی مادری زبان "بلوچی" بولتی ہے۔ بلوچی زبان آریائی زبانوں کے گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔ بلوچی زبان رسم الخط نہیں رکھتی۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں بلوچستان کی بنیادی ادبی زبان فارسی تھی مگر بعد کے سالوں میں انگریز سامراجیوں کی حکومت کی سرگرمی کے وقت میں بہت حد تک فارسی زبان کی جگہ "اردو" زبان نے لے لی۔ انگریز استعمار نے اپنے زیر تسلط بلوچستان میں بلوچی کلچر کو ترقی دینے میں کوئی خاص کوشش نہ کی یہاں تک کہ عوامی تعلیم کی طرف بھی بہت کم توجہ دی۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کے تناسب سے بلوچستان سارے ہندوستان میں سب سے پیچھے تھا۔ یہ حالات آج کے بلوچستان کو بھی درپیش ہیں۔ شرح

تعلیم بلوچستان میں بہت کم ہے سکولوں کی تعداد بھی دیگر صوبوں کی نسبت کم ہے۔

بلوچ اپنے گاؤں کے بزرگوں پر بہت زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں ان کے قبرستان، شاہراہیں اور ملک کے اہم مقامات، کسی نہ کسی "ولی محافظ" کے نام سے منسوب ہیں بزرگوں کی قبروں اور مزاروں کی زیارتوں پر بہت خلوص سے جاتے ہیں۔ زیارتوں پر دعا اور درخواست کے وقت اپنے مخصوص علاقائی اولیاء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ اولیاء اور بزرگ ان کی خواہشوں اور ضرورتوں کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں، بلوچوں کے مخصوص ضابطہ اخلاق ہیں لیکن یہ ان ضابطوں کی پاسداری میں بھی "بزرگوں" کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اگر کوئی "ملا"، سید یا عورت قرآن بہ سر یا شمشیر برہنہ بہ دست طرفین کے بیچ آجائے تو لڑائی بند کر دی جاتی ہے۔ اگر لڑائی کی حالت میں کوئی کسی پیر کی زیارت میں داخل ہو جائے تو ایسے آدمی کو بھی مارنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ پناہ دینے میں بھی بلوچ بہت فراخ دل ہیں اور پناہ گزینوں کے لئے آخری دم تک لڑتے ہیں۔ بلوچوں کے مشہور قبائل مری، کوچک، منگل، زہری، اچک زئی اور مگسی وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ خون کا بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ امانت کی حفاظت اور مہمان نوازی میں بھی مشہور ہیں، سیاہ کاری کی سزا بھی ان کے ہاں موت ہے۔ زیادہ تر لوگ کاشت کاری کے پیشے سے وابستہ ہیں اور خیموں میں رہتے ہیں۔

بلوچ قوم اپنے جغرافیے اور تہذیب و ثقافت کی بنا پر اپنا الگ تشخص رکھتی ہے جو اسے دیگر صوبوں سے منفرد کرتا ہے۔ پاکستانی اردو ناول نگاروں کے ہاں بلوچی تہذیب و ثقافت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ آغا گل پاکستانی ناول نگار ہیں جن کا تعلق بلوچستان سے ہے۔ وہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں بلوچی تہذیب و ثقافت کو اس کے حقیقی تناظر میں موضوع بنایا ہے۔

یہ آغا گل کا پہلا ناول ہے جس کا "میر آتا ڈیھ" کے عنوان سے براہوی زبان میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے جبکہ سنگر چنا اس ناول کو وفا جو رنڑپٹ کے عنوان سے سندھی زبان میں بھی ترجمہ کر چکے ہیں۔ "دشت وفا" میں بلوچستان کی ثقافت، زبان، سیاست اور تاریخ نمایاں نظر آتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ Epic novel ۱۹۷۰ء کی دہائی کے بلوچستان کی عکاسی کرتا ہے اور نہایت موثر انداز میں بلوچستان کے مسائل، محرومیوں اور تہذیبی ارتقاء کی پسماندگی کی وجوہات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جبکہ دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہو رہی ہے تو بلوچستان میں واپڈا کے کھمبوں سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو پہنچانا مشکل ہو جاتا ہے کہ زمانہ قدیم ہے یا جدید۔ "دشت وفا" علامتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے جس کی وجہ بلوچستان میں سماجی پابندیاں اور حالات تھے لیکن علامت نگاری محض ان کی مجبوری نہیں بلکہ یہ ایک تخلیق مہارت کے طور پر بھی ان کے ہاں سامنے آتی ہے۔ مذکورہ ناول مغربی تہذیب کی بلوچستان آمد اور بلوچی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب پر مغربی اثرات کا جائزہ بھی پیش کرتا ہے۔ انگریزی زبان اور تہذیب بہت تیزی سے ہماری تہذیب میں پیوست ہو رہی تھی ناول کی ہی وئن رخسانہ اور خورشید ہاؤس مناظر اس حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں:

> "رخسانہ کو پہلی بوتل میں نے غلط دے دی تھی اس کے بعد دو اس نے پی ڈالیں یعنی چھ پیگ برانڈ پی کر بھی وہ نارمل تھی۔"(۶)

روایتی اقدار کے حوالے سے دیکھا جائے تو بلوچستان میں تیزی سے آتی ہوئی تبدیلیاں ناول میں نظر آتی ہیں۔ والدین کی محبت کا سایہ جو اولاد کے لئے خوشگوار ٹھنڈک کا کام کرتا ہے، اخوت، محبت اور انسان دوستی جیسی تہذیبی اقدار ترقی کے نام پر تبدیل ہو رہی تھیں۔ اس تبدیلی کو کہیں علامتی انداز میں اور کہیں برملا آغا گل بیان

کرتے ہیں۔

"نمک حراموں! تم میں کوئی ایسا پر خلوص دوست نہیں جو میرے باپ کو قتل کر دے۔" (۷)

عیاشی کا بازار گرم تھا جہاں اقدار کا داخلہ ممنوع تھا۔ مادی ترقی رشتوں کو کھوکھلا کر رہی تھی۔ اسی لئے خورشید ہاؤس میں خورشید کے والد غلام مرتضیٰ کی وفات پر بجائے سوگ کے اطمینان کا اور خوشی کا سماں تھا۔ بلوچستان کی شہری اور دیہاتی زندگی کے اطوار میں بھی بہت فرق نظر آتا ہے۔ شہری زندگی میں "ہوٹل" ایک ادارے کی حیثیت حاصل کر چکا تھا جہاں لوگ اپنے غموں کو بہلانے کے لئے آتے تھے۔ شراب اور شباب سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے، لیکن پاکستان جیسے اسلامی ملک میں یہ سہولیات بغیر کسی روک ٹوک کے دستیاب ہیں، ناول میں اس ضمن میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

"بم دھماکوں، فائرنگ اور قتل وغارت کے باوجود کوئٹہ میں زندگی کا وہی رنگ ڈھنگ تھا۔ سر شام لوڈر ہوٹل کے لان میں بارٹینڈر وردیاں پہنے محفل سجاتے۔ ساقی بار، امداد ہوٹل میں رونق آجاتی۔ متوسط طبقہ کے لوگ جناح روڈ اور سرکلر روڈ کی دکانوں سے شراب خریدتے جب کہ غریب غرباء تھانہ روڈ اور ملحقہ گلیوں میں ٹھرا پیتے۔ ہوٹلوں میں فلمی گیت بجا کرتے، بازار حسن میں آنے جانے والے ان ہوٹلوں میں گیت سنتے کچھ روتے کچھ خوش ہوتے۔" (۸)

کوئٹہ کی سوسائٹی میں یہ ہوٹل زندگی کے ہائیڈ پارک کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ جہاں رونے اور ہنسنے والوں کے لئے تمام سامان میسر نظر آتا ہے۔ جہاں آزادی اور خود مختاری نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں بلوچستان میں لوگ آزادی اور خود مختاری کی بجائے بہت محروم قسم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر سو غربت وعسرت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ یہ انگریز حاکمین کی پالیسیوں کے علاوہ دیسی حکمرانوں کے غلط فیصلوں کی بدولت بھی ہے۔ آغا گل" ماہنامہ سپوتنک "میں تہذیبی پسماندگی کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہیں:

"دیگر ممالک کی طرح ہمارا بھی سیاسی، معاشی، شہری، سماجی قبائلی تنظیمی ڈھانچہ بدل کر رکھ دیا۔ سماجی تانا بانا ٹوٹ کر رہ گیا۔" (۹)

ان کا مقصد بلوچی عوام کو شعور اور آگاہی بخشنا ہے۔ بلوچی عوام کو دانستاً بنیادی حقوق اور تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے تاکہ مسائل میں الجھی پسماندہ قوم پر حکمرانی آسان ہو سکے۔ آغا گل، بلوچستان کے بنیادی مسائل کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ بلوچستان میں عمومی پیشہ بھیڑیں پالنا اور ان کی اُون اور گوشت وغیرہ سے ضروریات زندگی پوری کرنا ہے۔ جس طرح بھیڑیں اپنے چرواہوں کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں، آغا گل کے ناولوں میں بلوچی عوام کی یہ نفسیات بھی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ اپنے سرداروں کے اشاروں پر بعض اوقات اپنے ہی لوگوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیتے ہیں۔ یہ سردار انہیں حقوق کی جدوجہد کے نام پر مسلح جدوجہد میں لگا کرے اپنے ذاتی مفادات پورے کرتے ہیں اور بلوچستان کے وسائل اور ورثے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بلوچستان کے ان حالات کی عکاسی ناول میں ان الفاظ میں نظر آتی ہے:

"سارے گروپ کو یقین تھا کہ سرداروں نوابوں کے اکسانے پر غیر منظم بے مقصد جدوجہد ہو رہی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا؟ کیا ان سرداروں کو دوبارہ حکومت تفویض کر دی جائے گی جو صدیوں سے ظلم ڈھا رہے ہیں۔ رہی لسانی گروہ بندی کی بات تو آخر کیا کیا انہوں نے اپنے علاقوں کے لئے؟ پہلا ہسپتال پہلے سکھر اور پھر کوئٹہ میں اینگلس چرچ کے سکاٹ مشنریز نے

کھولا۔ بلوچستان کی پہلی ایکس رے مشین پروٹیسنٹ مشنریز لائے۔ بلوچستان میں تقدیر کا تصور سکاٹ لینڈ کے ڈاکٹر ہنری ہالینڈ نے بدلا۔ اس نے خیموں میں، میدانوں میں موتیا کے آپریشن کر کے بینائی بحال کر کے دیکھنے کی نعت لوٹادی" (۱۰)

شمالی علاقہ کے کے زیادہ تر علاقوں میں سرداری نظام ہے۔ سرداری نظام اگرچہ بلوچ قبائل کا روائتی نظام ہے لیکن جیسا کہ اس پیراگراف سے ظاہر ہو رہا ہے کہ سرداروں کی بجائے انگریزوں نے بلوچستان کی تہذیبی ترقی کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے عوام کی سوچ کو تبدیل کیا جو ساری عمر قسمت کا لکھا تسلیم کر کے اندھے پن، لنگڑے پن اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر گزار دیتے تھے۔ انہیں ہسپتالوں، سکولوں، سڑکوں اور پلوں سے کسی قدرت آشنا کروایا لیکن بعد میں انہی تاریخی پلوں کو بارود سے اڑانا اپنے سرداروں کی اطاعت میں، ان بلوچوں کے لئے قابل فخر کارنامہ بن گیا۔

"عالمگیر نے کچھ کا پل اڑانے کی کوشش کی، بسوں کو لوٹا تو بات بگڑ گئی۔ نجیب بہت ناراض ہوا یہ کیسی تحریک ہے مسافروں کو لوٹنا، پل اڑانا، یہ تو تخریب کاری ہے .... اتفاقاً اس کی زبان سے نکلا کہ پل اڑانا ایک تکنیک ہے ورنہ جتنا بارود رکھ دو پل نہیں اڑے گا۔ کچھ کا پل نہ ٹوٹا بس ایک شگاف سا پڑ گیا۔ اگر وہ ہوتا تو پل زمین پہ آرہتا آدھے بارود میں۔"(۱۱)

عموماً پل جو ایک طرف لوگوں کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہوتا ہے تو دوسری طرف تہذیبی ارتقا میں نہایت معاون ثابت ہوتا ہے۔ اسے ناعاقبت اندیشی میں اڑادینا، بلوچ سماج کو قدیم دور میں بھیجنے کے مترادف ہے۔ بلوچ ثقافت میں مختلف وجوہات کی بنا پر اسلحہ رکھنا ایک رواج بن چکا ہے۔ اگرچہ جانبازی اور دلیری ان کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن حالات انہیں مختلف ڈگر پر لے آئے ہیں۔ بلوچ قوم ایک دوسرے کو تحائف دینے میں بھی "اسلحہ" کو مقدم رکھتی ہے، چاہے یہ شادی کا موقع ہو یا بچوں کی پیدائش کا، عزیز و اقارب "اسلحہ" کے تحائف کے ذریعے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں:

"رخسانہ کو بطور بھابھی جواب تک تحفے ملے تھے ان سے وہ اسلحہ کی دکان کھول سکتی تھی۔"(۱۲)

مصنفین نے بلوچ قبائل کے زیر استعمال اسلحے کی تفصیلات بھی باریک بینی سے فراہم کی ہیں۔ جن میں چیکو سلواکیہ کی سکار پین، جرمنی کا ہیکلر کوف پستول، روسی کلاشنکوف، واہ فیکٹری کی تھری جی اور نائین ایم ایم وغیرہ زیادہ عام ہیں۔ بلوچ قبائل اسلحے کو اپنا زیور قرار دیتے ہیں۔ بعض اوقات دیرینہ دشمنی مخاصمتیں اور قتل وغارت بھی بلوچ تہذیب اور کلچر کا حاصل دکھائی دیتی ہے۔ سیاستدان، نواب، سردار اور وڈیروں کی حفاظت پر مامور فوج بھی جدید اسلحہ سے لیس ہوتی ہے۔ "دشت وفا" میں بلوچ عوام کی مذہب سے وابستگی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی پیروی بھی عیاں ہوتی ہے:

"جمعہ کی نماز ہوتی تو عبادت خشوع و خضوع سے کرنے کے لئے سفید ٹوپیاں پہن کر مسجدوں میں چلے آتے۔ ٹریفک رک جاتی جمعہ کے روز ہوٹلوں میں نائی کی دکانوں میں قوالیاں گونجتی تھیں۔ اذان کا وقت ہوتا تو ہوٹلوں کی ریکارڈنگ بند کر دی جاتی محرم میں بعض ہوٹل دس روز بند رہتے سینما بھی کم از کم تین روز تو ضرور بند رہتے۔"(۱۳)

اسلامی ثقافت کے مظاہر، نماز، آذان، محرم کا احترام اور دیگر شعائر اسلامی کے مناظر بلوچ سماج میں عموماً نظر آتے ہیں لیکن یہاں مذہبی لوگوں اور عبادت گزاروں کی اپنی دنیا ہے، عاشقوں کی اپنی دنیا، پینے والوں اور

سمگلروں کی اپنی اپنی جولان گاہ ہے۔ لیکن وقت کے تیز دھاڑ تھپیڑوں کی وجہ سے اس سخت پتھریلی دھرتی نے خون اگلنا شروع کر دیا۔ دہشت گردی کا ناسور جگہ جگہ سے پھٹ کر رسنا شروع ہو گیا، جو ان گنت زندگیاں نگل گیا اور بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کو بھی داغدار کر گیا۔

آغا گل ایک اہم ناول نگار ہیں۔انھوں نے بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں بلوچی ،براہوی ، پشتو، سرائیکی کے علاوہ عربی اور فارسی وغیرہ کے الفاظ سے اپنے اسلوب کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ تاریخی و تہذیبی حقائق کے بیان میں مختلف تلمیحات اور ان زبانوں کے الفاظ و محاورات سے ناول کے تاثر میں اضافے کرتے ہیں۔
آغا گل کا ناول "دشت وفا" بلوچ عوام کی کئی نسلوں پر مشتمل تہذیبی و ثقافتی پسماندگی، غربت اور کسم پرسی کے پیچھے کار فر عناصر اور وجوہات کا مدلل جائزہ پیش کرتا ہے۔ آغا گل بلوچستان کو ایک پر امن اور ترقی یافتہ صوبہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اس لئے بلوچستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے والے عناصر کو کبھی علامتی انداز میں اور کبھی برملا بے نقاب کرتے ہیں اور بلوچ سماج کی مختلف زاویوں سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ بلوچستان کے پہاڑوں، ریگزاروں، صحراؤں، بیلوں اور ساحلوں کو محب وطن کی آنکھ سے پکچرائز کر کے قارئین تک اس طرح پہنچاتے ہیں کہ یہ بے آب و گیاہ دشت اپنی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے اور بلوچ قوم کی تاریخ، تہذیب اور سیاست سے بھی مرحلہ وار قاری تک اصل حقائق کی بہم رسائی ہو جاتی ہے۔

ناول "بیلہ " بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کا حقیقی عکاس ہے۔ بلوچستان کی تہذیب و ثقافت پاکستان کے دیگر صوبوں کے ساتھ کئی لحاظ سے مشابہہ بھی اور کئی لحاظ سے منفرد و متضاد بھی۔ یہاں کا قبائلی اور معاشرتی ڈھانچہ اپنی منفرد خصوصیات کے لحاظ سے اپنی الگ شناخت کا حامل ہے۔ بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کے مختلف رنگ "بیلہ" سے نمایاں ہوتے ہیں۔ آغا گل، بلوچستان کے اعلی تخلیقی صلاحیتوں سے مالامال ادیب ہیں۔
"بیلہ " اگرچہ بہت طویل ناول نہیں ہے تاہم اس کا پلاٹ مضبوط ہے۔ اس کے کردار بلوچی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں یہاں تک کہ کرداروں کے نام بھی بلوچی تمدن میں مروج ناموں میں سے ہیں۔"بیلہ " آغا گل کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۲ میں قلات پبلی شرز سے شائع ہوا۔ پروفیسر سوسن براہوی نے بیلہ کا براہیوی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ آغا گل کی تخلیقات کا مرکز و محور صوبہ بلوچستان، اس کی روایات ، تہذیب و ثقافت اور متوسط طبقے کی زندگی ہے ۔ڈاکٹر انور سدید نے آغا گل کو بلوچستان نگار کیا ہے ان کے مطابق:

> "ڈاکٹر انور سدید نے آغا گل کو بلوچستان نگار کہا ہے۔ ان کے مطابق آغا گل کا تخلیق کردہ ادب ایک مخصوص علاقائی کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔"(۱۴)

بلوچی ادب کے حوالے سے آغا گل اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ آغا گل "بیلہ " میں ایک کوچ ڈرائیور "رحمان" کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جن راستوں سے وہ گزرتا ہے، جن مقامات پر پڑاؤ کرتا ہے، وہاں کی تہذیب و ثقافت کے رنگ قاری کو بلوچستان کے بہت سے ان دیکھے مناظر سے آشنائی فراہم کر دیتے ہیں۔ان کی بلوچستان اور بلوچی تہذیب و ثقافت سے محبت ناول میں جابجا نظر آتی ہے۔ بلوچستان کے مختلف مقامات سے شناسائی بھی حد درجہ کی ہے یہی وجہ ہے کہ ناول "بیلہ "ہمیں بلوچستان کے بہت سے شہروں قصبوں سے متعارف کرواتا ہے۔

> "اور پھر کوئٹہ سے روانہ ہوتا تو بہت اچھا لگتا کوئٹہ سے نکلے تو لک پاس اترے تو پڑرنگ آباد، مستونگ، چوتو، کھڈ کوچہ، منگوچر، کوہنگ، سوراب اور قلات سے نکلے تو بینچہ ، سوراب زہری کراس پھر انجیرہ اور لاکھوریاں اور باغبانہ، خضدار کے ہوٹل جہاں کھانا بہت اچھا ملتا ہے۔ دم لے

کے نکلتے تو کلی اسماعیل، کوشک، ندی، وڈھ لک، باران کے موڑ نمانی، بیلہ اور پھر یارو... پھر وینڈر میانی، گڈانی کراس چک نواز، چورنگی، جس کے بعد حب کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ جب ندی پر بلوچستان کا علاقہ ختم ہوتا ہے تو سامنے کراچی، رحمان کراچی میں داخل ہوتا ہے۔"(۱۵)

انھوں نے جس طرح بلوچستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا تذکرہ کرتے ہیں اس سے ان کی قوت مشاہدہ کی تیزی اور سیر وسیاحت کے شوق کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "بیلہ" کو پڑھنے کے بعد قاری نہ صرف اچھی کہانی سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ وہ بلوچستان کے سفر نامے کا بھی مزہ لیتا ہے۔ خوبصورت سرورق کے ساتھ "بیلہ" کا عنوان بھی گہری معنویت کا حامل ہے۔ "بیلہ" دریا کنارے اگی ہوئی گھنی جھاڑیوں پر مشتمل علاقے کو بھی کہا جاتا ہے۔ بلوچستان میں موڑ نمانی اور یارو کے درمیان کا علاقہ "بیلہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن لفظ "بیلہ" کی وضاحت مصنف ڈاکٹر سرور کی زبانی اس طرح کرواتے ہیں:

"ڈاکٹر آنکھوں میں ایک دوائی ڈالتے ہیں بیلا ڈونا، جس سے آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں خواتین اپنی آنکھوں کو خوبصورت بنانے کے لئے یہ دوائی ڈالا کرتی تھیں۔ بیلا کا مطلب ہے خوبصورت اور ڈونا کا مطلب ہے خاتون یعنی خوبصورت عورت۔"(۱۶)

آغا گل کے ناول میں "بیلہ" ہیروئن کا نام ہے یہ نام استاد رحمن نے دیا ہے۔ یہ کردار بلوچستان کی روایتی عورتوں کے برعکس ہے۔ بلوچ قبائل میں عورتوں کو تعلیم نہیں دلوائی جاتی۔ ان کی مخلوط تعلیم کا تصور بھی گناہ ہے۔ شاہ محمد مری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"بچیوں کا تعلیم حاصل کرنا تو شاید ہماری سماجی ضرورت نہیں رہی بلکہ یہ شاید بہت سے بلوچوں میں سماجی مقام میں کمی کا باعث ہوتا ہے۔"(۱۷)

شمالی علاقہ جات اور بلوچستان میں نہ صرف عورت تعلیمی لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہے بلکہ وہ معاشرتی جبر کو بھی برداشت کرتی ہے۔ اسی لیے بعض لوگ حقوق نسواں کے طور پر بلوچستان میں عورت کی حیثیت اور اسکی پسماندگی وجبر کے حوالے سے تنقید بھی کرتے ہیں۔ ناول کی ہیرؤئن "بیلہ" بلوچستان کی روائتی وفادار عورت کی نمائندگی نہیں کرتی، وہ جدید تعلیم کے حصول کے لئے کراچی جاتی ہے۔ اپنی میڈیکل کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لئے استاد رحمن کو استعمال بھی کرتی ہے۔ پردے میں رہنے کی بجائے مردانہ حلیہ بنائے رکھتی ہے۔ اس کے کردار میں مثبت پہلو کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ استاد رحمان اس پر دولت نچھاور کرتا ہے، چاہے اسے اس کام کے لئے بزرگوں کے بتائے ہوئے مردانگی، سچائی، نیکی اور ایمانداری کے اصولوں سے ہٹ کر ہیروئن جیسے نشے کی سپلائی ہی کرنی پڑے۔ "بیلہ" ناول اگرچہ بلوچستان کی بہت سی روایات کی عکاسی کرتا ہے لیکن "عورت" کے معاملے میں یہاں حقیقی بلوچی عورت کی عکاسی نظر نہیں آتی۔

ناول میں آغا گل نے بلوچستان کے براہوی قبیلے کی شاندار روایات کو بھی متعارف کروایا ہے۔ براہوی لوگ وعدے کی پاسداری کو ہر صورت نبھاتے ہیں۔ رحمان کی دادی مرتے وقت رحمان کو سیٹھ شمروز کے حوالے کرتی ہے اور اس سے رحمان کی حفاظت کا وعدہ لیتی ہے۔ جسے سیٹھ شمروز ساری عمر نبھاتا ہے۔

"یہ ایک براہوی کا وعدہ ہے" شمروز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی۔ میرے جیتے جی رحمان کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں زبان دیتا ہوں کہ اوپر اللہ، زمین پہ میں اس کی حفاظت کروں گا۔"(۱۸)

سیٹھ شمروز پوری ایمانداری سے اپنا وعدہ نبھاتا ہے اور رحمان بھی تمام عمر سیٹھ شمروز کا وفادار رہتا ہے۔
براہوی قبائل کی ایک خوبی ان کی بہادری بھی ہے۔ اس لئے ان کے ہاں دشمنیاں پالنا اور نبھانا بھی ان کی روایات کا حصہ ہے۔ اسی تناظر میں ناول کا بنیادی کردار رحمان، سیٹھ شمروز کے بیٹے کے قتل کا بدلہ لیتا ہے۔

"میں ایک براہوی ہوں دشمن سے بدلہ لینا میرا ایمان ہے۔"(۱۹)

براہوی قبائل کے عقائد اور روایات کا پرچار پورے ناول میں نظر آتا ہے۔ یہ لوگ پیروں، فقیروں اور مزاروں پر بھی بہت اعتقاد رکھتے ہیں۔ مشکلات اور مصائب میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ رحمان جب "بیلہ" کی محبت کا اسیر ہو جاتا ہے تو قلات سے گزرتے ہوئے "پر لیٹو" کے مزار پر دعا مانگتا ہے۔

"پیر لیٹو! بیلہ مجھے دے دو، سر سے پاؤں تک پوری کی پوری، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"(۲۰)

ناول میں صوبہ بلوچستان کی تہذیب وثقافت، رسم ورواج، سوچ اور اندازو اطوار کا ذکر مصنف کی اپنے علاقے سے گہری وابستگی کا اظہار ہے۔ مصنف نے حقائق کو بنیاد بناتے ہوئے ناول کی بنیاد استوار کی ہے۔ بلوچ قوم کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھی تاریخی حوالوں کے ساتھ رقم کیا ہے۔ انگریزی دور سے لیکر آج تک بلوچ قوم کی پسماندگی کی وجوہات کو حقیقی پس منظر میں ناول کی کہانی میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ ذرا بھی بوجھل پن کا تاثر نہیں دیتیں لیکن قاری کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ضرور ہٹا دیتی ہیں۔ اسی حوالے سے اپنے ایک بیان میں مصنف بلوچستان کو ایک قبر اور ایک یتیم خانہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں حکومت اور سرداروں کا اقتدار چلا آرہا ہے اور عوام کو صرف "بھوک" مل رہی ہے۔ بلوچستان کے لوگ بنیادی حقوق سے محروم ہیں، انہیں جان ومال کا تحفظ بھی مکمل فراہم نہیں کیا جاتا، جگہ جگہ ناکے، چیک پوسٹیں اور سینکڑوں قسم کے ٹیکس اور قومی وسائل سے عوام کو محروم رکھنا ان کے اندر اشتعال انگیزی پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ بلوچستان میں تعلیم، امن اور صحت کی صورتحال مایوس کن ہے۔ اسی قسم کے دیگر مسائل جو بلوچی عوام کو درپیش ہیں انہیں ناول میں پیش کیا گیا ہے۔

آغا گل نے بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کی قدامت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ کس طرح حکمرانوں نے ان قدیم زبانوں پر ایک نووار زبان کو نافذ کر دیا۔ اگر مراسلات کے لیے یہ زبان استعمال کرنا ضروری تھی تو کم از کم قدیم بلوچی زبانوں کو بھی محفوظ رکھنے اور انہیں ترقی یافتہ بنانے کے لئے غفلت نہیں برتنی چاہیے تھی کیونکہ زبان کسی بھی قوم کی شناخت کا ایک اہم ترین جزو ہوتی ہے۔ آغا گل "بیلہ "ناول میں مقامی زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے نیا اسلوب متعارف کرواتے ہیں۔ وہ بلوچی لوک قصوں اور ان کے مختلف کرداروں کو بھی تشبیہات کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

ناول نگار نے بڑے فنکارانہ انداز میں بلوچستان کی تہذیب وثقافت سیاست، ماحول، جغرافیہ، زبانوں اور مسائل کو پوری سچائی اور قوت مشاہدہ کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ ناول کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

بنیادی طور پر تہذیب و معاشرت کی عکاسی ناول کا ایک لازمی جز شمار کیا جاتا ہے۔ ناول کسی خطے میں رہائش پذیر لوگوں کی طرزِ زندگی، ان کے بودوباش اور رسم ورواج کا ترجمان ہوتا ہے۔ ناول نگار ملک کے کسی بھی خطے کی ثقافتی، سماجی اور تہذیبی حالات واقعات اور معاملاتِ زندگی کا آزادانہ جائزہ لیتا ہے اور ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ ناول نگار کسی بھی ملک کے خطے کی تہذیبی وثقافتی ورثے اور بودوباش کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اشتیاق احمد، کلچر (منتخب تنقیدی مضامین)، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص: ۸۴

۲۔ امان اللہ جہاں بانی، عملیاتِ قشون در بلوچستان، تہران ۱۷۰۳ء، ص ۱۸

۳۔ م۔ک پیکولین، بلوچ، مترجم: ڈاکٹر شاہ محمد مری، لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۰ء، ص ۲۸

۴۔ عزیز محمد بگٹی، بلوچستان شخصیات کے آئینہ میں، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۷

۵۔ عزیز محمد بگٹی، پروفیسر، بلوچستان ادب ثقافت اور سماج، کوئٹہ: ظہیر الدین بابر سپینز ر پرنٹرز، 1995ء، ص ۴۲۔۴۳

۶۔ آغا گل، دشت وفا، کراچی: فکشن ہاؤس ۲۰۱۷ء ص ۷۰

۷۔ ایضاً، ص ۱۰

۸۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۔ آغا گل، بلوچستان میں اردو، ماہنامہ سپوتنک، جلد ۲۹، شمارہ ۱۱، (مدیر: آغا امیر حسین)، لاہور: نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۷

۱۰۔ آغا گل، دشتِ وفا ص ۴۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۴۔ روشناس، ماہنامہ کراچی، مدیر اعلیٰ: محمد مصلح الدین، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۶، نومبر ۲۰۱۱ء ص ۱۶

۱۵۔ آغا گل، بیلہ، کوئٹہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، ۲۰۱۹ء ص ۱۹، ۱۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۳، ۳۲

۱۷۔ شاہ محمد مری، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب بلوچی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء ص ۲۲

۱۸۔ آغا گل، بیلہ، ص ۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۱